ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3959

Program: BS (Dars-e-Nizami)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیۂ عربی وعلومِ اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: فلسفۂ شریعتِ اسلامی (3959) • سطح: بی ایس (درسِ نظامی)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: روح کی حقیقت، اس کی اقسام اور انسانی وجود کا مادی تصور

سوال نمبر 1۔ روح کی حقیقت، اس کی اقسام اور موت کے بعد اس کے معدوم نہ ہونے کے تصور کو سامنے رکھتے ہوئے تجزیہ کریں کہ انسانی وجود کو صرف مادی وجود سمجھنا اس تصور سے کس طرح مختلف ہے؟ (20)

تعارف

انسان کیا ہے؟ یہ سوال اتنا ہی قدیم ہے جتنی خود انسانی سوچ۔ ہر دور کے اہلِ فکر نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اور جواب اس بات پر کھڑا ہوتا ہے کہ انسان کو صرف جسم سمجھا جائے یا جسم اور روح کا مجموعہ۔ فلسفۂ شریعتِ اسلامی میں اس سوال کی اہمیت دوچند ہے، کیونکہ انسان کی اخلاقی ذمہ داری، اس کے اعمال کی جزا و سزا، موت کے بعد کی زندگی اور آخرت کا پورا تصور اسی بنیاد پر قائم ہے کہ انسان میں ایک ایسی حقیقت موجود ہے جو مادے سے ماورا ہے اور جسے روح کہا جاتا ہے۔ اگر انسان محض گوشت، ہڈیوں اور کیمیائی عمل کا نام ہو تو نہ وہ مکلف ٹھہرے گا، نہ جزا و سزا کا کوئی جواز باقی رہے گا اور نہ موت کے بعد کسی زندگی کا کوئی امکان۔ اس کے برعکس اگر انسان جسم کے ساتھ روح کا حامل ہے تو زندگی کا مقصد، اخلاق کی بنیاد اور آخرت کا پورا نقشہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس جواب میں پہلے روح کی حقیقت اور اس کی اقسام بیان کی جائیں گی، پھر موت کے بعد روح کے معدوم نہ ہونے کا تصور واضح کیا جائے گا، اور آخر میں اس کا تقابل اس مادی تصور سے کیا جائے گا جو انسانی وجود کو صرف مادی وجود قرار دیتا ہے۔

روح کی حقیقت: قرآن و حکمت کی روشنی میں

قرآن مجید نے روح کے بارے میں بنیادی بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ روح اللہ کے امر سے ہے اور انسان کو اس کے بارے میں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے (حوالہ: سورۃ الاسراء، آیت 85)۔ اس ایک جملے میں دو بڑی حقیقتیں پوشیدہ ہیں: ایک یہ کہ روح مادی دنیا کی مخلوقات جیسی کوئی چیز نہیں بلکہ اس کا تعلق عالمِ امر سے ہے، اور دوسری یہ کہ اس کی مکمل ماہیت انسانی عقل کی گرفت سے باہر ہے۔ اسی لیے اہلِ علم نے روح کی حقیقت کو مکمل طور پر بیان کرنے کے بجائے اس کے آثار و افعال سے اسے پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ انسان سوچتا ہے، ارادہ کرتا ہے، خوش اور غمگین ہوتا ہے، اچھے برے میں تمیز کرتا ہے اور اپنے رب کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے؛ یہ سب امور جسم کے مادی اجزا سے پوری طرح واضح نہیں ہوتے، کیونکہ مادے میں نہ شعور ہے، نہ ارادہ اور نہ خود آگاہی۔ جسم کے اعضا آلات ہیں اور روح ان آلات کو استعمال کرنے والی حقیقت ہے۔ آنکھ دیکھنے کا آلہ ہے مگر دیکھنے والا، کان سننے کا آلہ ہے مگر سننے اور سمجھنے والا اس سے الگ ایک جوہر ہے جسے روح یا نفس کہا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں انسانی حقیقت پر مفصل بحث کی ہے اور انسان کو جسم اور روح دونوں کا مرکب قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح جسم غذا سے پروان چڑھتا ہے اسی طرح روح کی اپنی غذا، اپنی ترقی اور اپنی بیماریاں اور صحت ہے۔ روح کی صحت اچھے عقیدے، نیک اعمال اور پاکیزہ اخلاق سے ہے اور اس کی بیماری جھوٹے عقیدے، بد عملی اور بری خصلتوں سے۔ یہ تفصیل بتاتی ہے کہ شریعت کے احکام صرف جسم کے لیے نہیں آئے؛ نماز، روزہ، زکاۃ اور حج جیسی عبادات کا اصل مخاطب روح ہے، جسم صرف اس کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ جب تک روح کی حقیقت تسلیم نہ کی جائے، عبادات کی روحانی حکمتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں انسان کو اپنی روح کی اصلاح کی طرف مسلسل توجہ دلائی گئی ہے اور اسے دنیا کی زندگی کا سب سے بڑا کام قرار دیا گیا ہے۔

روح کی اقسام

اہلِ حکمت اور صوفیائے کرام نے روح کے مراتب اور قوتوں کی مناسبت سے اس کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ یہ تقسیم دراصل ایک ہی انسانی روح کی مختلف قوتوں اور حالتوں کی تقسیم ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کے اندر زندگی، حرکت، خواہش اور عقل و شعور کی الگ الگ سطحیں موجود ہیں۔ راقم کے نزدیک پر بیان کی جانے والی اقسام درج ذیل جدول میں پیش کی گئی ہیں۔

جدول: روح کی معروف اقسام اور ان کے افعال

قسم	دائرہ کار	افعال و آثار
روحِ نباتی	نباتات اور جسم کی نشوونما	غذا کا ہضم ہونا، جسم کی بڑھوتری اور نسل کی بقا جیسے امور
روحِ حیوانی	حیوانات اور انسان دونوں میں	حرکت، احساس، بھوک پیاس اور خواہشات کا پیدا ہونا
روحِ انسانی (ناطقہ)	صرف انسان کے لیے مخصوص	عقل و شعور، ارادہ و اختیار، اخلاقی تمیز اور معرفتِ الٰہی

نفس کی حالتیں	انسانی روح کے مراتب	امّارہ (برائی کی ترغیب)، لوّامہ (ملامت کرنے والا ضمیر)، مطمئنہ (اطمینان یافتہ روح)

اس جدول سے واضح ہوتا ہے کہ انسان میں نباتی زندگی کی سطح بھی ہے، کیونکہ اس کا جسم بڑھتا ہے اور غذا حاصل کرتا ہے؛ حیوانی سطح بھی ہے، کیونکہ وہ محسوس کرتا ہے، حرکت کرتا ہے اور خواہشات رکھتا ہے؛ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں وہ انسانی روح بھی ہے جو جانوروں میں نہیں پائی جاتی۔ یہی روحِ ناطقہ اسے اشرف المخلوقات بناتی ہے، کیونکہ اسی کی بدولت وہ خیر و شر پہچانتا ہے، اپنے خالق کو تلاش کرتا ہے اور اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ نفس کی تین حالتوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے: نفسِ امّارہ انسان کو برائی پر اکساتا ہے، نفسِ لوّامہ غلطی پر ملامت کر کے اسے اصلاح کی طرف لاتا ہے، اور نفسِ مطمئنہ وہ بلند ترین سطح ہے جس میں روح اللہ کی رضا پر مطمئن ہو جاتی ہے۔ شریعت کی پوری اخلاقی تربیت دراصل نفس کو امّارہ سے مطمئنہ تک پہنچانے کا نظام ہے۔

موت کے بعد روح کا معدوم نہ ہونا

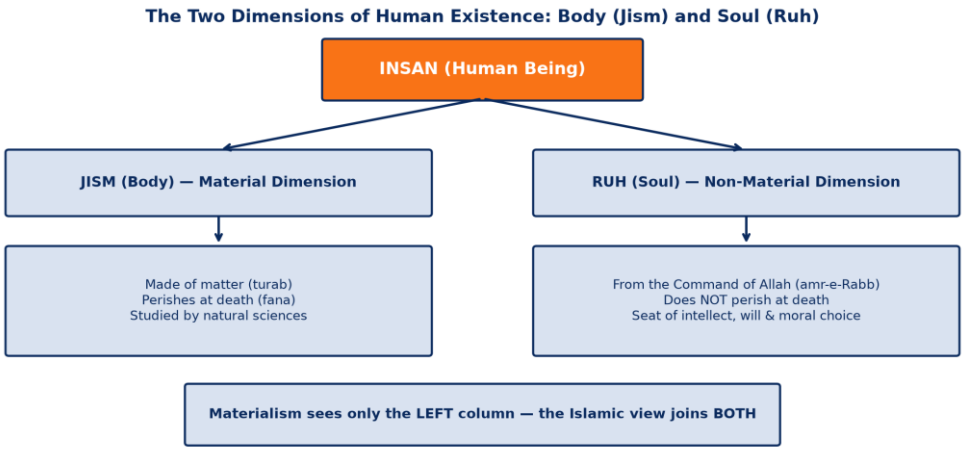
اسلامی تصور کے مطابق موت روح کا خاتمہ نہیں بلکہ جسم سے اس کی جدائی ہے۔ جس طرح نیند میں روح کا جسم سے تعلق جزوی طور پر کم ہو جاتا ہے اور جاگنے پر بحال ہو جاتا ہے، اسی طرح موت میں یہ جدائی اس دنیا کے اعتبار سے مستقل ہو جاتی ہے، مگر روح باقی رہتی ہے اور عالمِ برزخ میں اپنی حالت کے مطابق زندگی گزارتی ہے۔ قرآن مجید نے شہداء کے بارے میں واضح طور پر فرمایا ہے کہ انہیں مردہ نہ کہا جائے بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے یہاں رزق پاتے ہیں (حوالہ: سورۃ آلِ عمران، آیت 169)۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جسمانی موت کے بعد بھی انسانی شخصیت ختم نہیں ہوتی۔ اسی طرح فرعون کے ساتھیوں کے بارے میں ذکر ہے کہ قیامت سے پہلے بھی ان کی روحیں عذاب کے سامنے پیش کی جاتی ہیں (حوالہ: سورۃ المومن، آیت 46)، جس سے برزخی زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔

عقلی اعتبار سے بھی یہ بات قابلِ فہم ہے کہ انسان کے اعمال، اس کے ارادے اور اس کی شخصیت محض جسم سے وابستہ نہیں۔ اگر روح موت کے ساتھ معدوم ہو جاتی تو جزا و سزا کا تصور بے معنی ہو جاتا، کیونکہ سزا یا انعام اسی کو مل سکتا ہے جو باقی ہو۔ دنیا میں ظالم اکثر سزا سے بچ نکلتے ہیں اور مظلوم اکثر انصاف سے محروم رہتے ہیں؛ اللہ کے عدل کا تقاضا

ہے کہ ایک ایسی زندگی ہو جہاں مکمل حساب ہو۔ یہ حساب اسی وقت ممکن ہے جب روح موت کے بعد بھی باقی ہو۔ صوفیائے کرام نے اسے یوں سمجھایا ہے کہ جسم روح کے لیے لباس یا سواری کی مانند ہے؛ لباس کے پھٹ جانے سے پہننے والا ختم نہیں ہوتا اور سواری کے رہ جانے سے سوار معدوم نہیں ہو جاتا۔ یہ مثال حقیقت کو مکمل بیان تو نہیں کرتی مگر بات کو ذہن کے قریب ضرور لاتی ہے۔

انسانی وجود کا مادی تصور: ایک تنقیدی جائزہ

مادی تصور کے مطابق انسان صرف مادے کا ایک پیچیدہ مجموعہ ہے؛ اس کے خیالات دماغ کے کیمیائی عمل کا نتیجہ ہیں، اس کی اخلاقی قدریں معاشرتی ارتقا کی پیداوار ہیں اور موت کے ساتھ اس کا وجود ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ اس تصور کے پیچھے جدید سائنس کی وہ کامیابیاں ہیں جنہوں نے مادی دنیا کے اسرار بڑی حد تک کھول دیے ہیں۔ مگر یہ تصور چند بنیادی سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ پہلا سوال شعور کا ہے: مادہ بے جان اور بے شعور ہے، تو بے شعور ذرات کے اجتماع سے شعور، ارادہ اور خود آگاہی کیسے پیدا ہو گئی؟ دوسرا سوال اخلاقی ذمہ داری کا ہے: اگر انسان محض مادی قوانین کا پابند ایک نظام ہے تو اسے اس کے عمل پر ذمہ دار کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ جس طرح مشین اپنے عمل کی ذمہ دار نہیں ہوتی، اسی طرح خالص مادی انسان بھی نہیں ہو سکتا۔ تیسرا سوال انصاف کا ہے: اگر موت پر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے تو ظالم اور مظلوم، نیک اور بد، سب برابر ہو جائیں گے اور زندگی بے مقصد ہو کر رہ جائے گی۔



شکل: انسانی وجود کے دو پہلو — جسم (مادی) اور روح (غیر مادی)

دونوں تصورات کا فرق عملی زندگی میں بھی نمایاں ہے۔ روح کے قائل انسان کے لیے زندگی ایک امتحان اور امانت ہے؛ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے چھپے ہوئے اعمال بھی محفوظ ہیں اور اس کا حساب ہوگا، اس لیے وہ تنہائی میں بھی برائی سے بچتا ہے۔ اس کے برعکس خالص مادی تصور انسان کو بالآخر اس نتیجے کی طرف لے جاتا ہے کہ زندگی کا مقصد بس زیادہ سے زیادہ لذت اور فائدہ حاصل کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن معاشروں میں مادی تصور غالب آ جاتا ہے وہاں شرحِ جرم، خود غرضی اور ذہنی بے چینی بڑھ جاتی ہے، کیونکہ قانونی گرفت سے بچ جانے والا عمل ان کے نزدیک عملاً جائز ہو جاتا ہے۔ اسلامی تصور انسان کو اس بحران سے نکالتا ہے کہ وہ جسم کی ضروریات کو بھی تسلیم کرتا ہے اور روح کی بالادستی کو بھی؛ جسم کو روح کی سواری اور دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیتا ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ روح انسانی وجود کی اصل حقیقت ہے، جس کی اقسام اور مراتب انسان کی نباتی، حیوانی اور عقلی زندگی کو واضح کرتے ہیں، اور یہ موت کے بعد معدوم نہیں ہوتی بلکہ برزخ اور آخرت میں اپنے انجام تک باقی رہتی ہے۔ انسانی وجود کو صرف مادی وجود سمجھنا اس تصور سے بنیادی طور پر مختلف ہے کیونکہ مادی تصور شعور، ارادے، اخلاقی ذمہ داری اور عدلِ الٰہی جیسے سوالات کا تشفی بخش جواب نہیں دے سکتا، جبکہ روح کا اسلامی تصور ان سب سوالات کو ایک مربوط نظام میں جوڑ دیتا ہے۔ فلسفۂ شریعت کی رو سے یہی مربوط تصور انسان کو مکلف بناتا ہے، اس کے اعمال کو معنی دیتا ہے اور اسے دنیا میں بھی پرامن اور آخرت میں بھی کامیاب زندگی کی راہ دکھاتا ہے۔

سوال نمبر 2: جزا و سزا کا تصور اور اخلاقی رویے کی اصلاح

سوال نمبر 2۔ ایک معاشرے میں لوگ اچھے اور برے اعمال کے نتائج کو صرف دنیاوی زندگی تک محدود سمجھتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں جزا و سزا کے اسباب اور مختلف صورتوں کے تصور کو استعمال کرتے ہوئے بتائیں کہ لوگوں کے اخلاقی رویے کی اصلاح کیسے کی جا سکتی ہے؟ (20)

تعارف

کسی بھی معاشرے کی اخلاقی صحت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے افراد اپنے اعمال کے نتائج کے بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں۔ اگر لوگوں کا یقین ہو کہ اچھے اور برے عمل کا نتیجہ صرف اسی دنیا تک محدود ہے، تو اخلاق کا پورا نظام دنیاوی فائدے اور نقصان کی ترازو میں تلنے لگتا ہے: جو غلط کام پکڑے جانے کے خطرے کے بغیر فائدہ دے، وہ کر گزرنا 'عقلمندی' سمجھا جائے گا، اور جو نیکی دنیاوی نقصان کا باعث ہو اس سے بچنا 'سمجھداری' کہلائے گا۔ اسلام کا تصورِ جزا و سزا اس سوچ کی بنیاد سے اصلاح کرتا ہے۔ اس کے مطابق انسان کا ہر عمل محفوظ ہوتا ہے، اس کا نتیجہ دنیا میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے اور آخرت میں تو یقینی طور پر ظاہر ہو گا۔ اس جواب میں پہلے اس صورتِ حال کا تجزیہ کیا جائے گا کہ اعمال کو دنیاوی نتائج تک محدود سمجھنے سے معاشرے پر کیا اثرات پڑتے ہیں، پھر جزا و سزا کے اسباب اور اس کی مختلف صورتیں بیان کی جائیں گی، اور آخر میں بتایا جائے گا کہ اسی تصور کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے اخلاقی رویے کی اصلاح کیسے کی جا سکتی ہے۔

مسئلے کی نوعیت: نتائج کو دنیا تک محدود سمجھنا

جب کوئی معاشرہ اعمال کے نتائج کو صرف دنیاوی زندگی تک محدود سمجھ لیتا ہے تو اس کے کئی خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ اولاً، اخلاق مشروط ہو جاتا ہے: انسان نیکی تب کرتا ہے جب اسے شہرت، فائدہ یا کم از کم نقصان سے حفاظت نظر آئے، اور برائی سے تب بچتا ہے جب قانون یا معاشرے کی گرفت کا خوف ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تنہائی میں، جہاں نہ کیمرہ ہے نہ گواہ، اخلاق بے معنی ہو جاتا ہے۔ ثانیاً، دنیا میں جزا و سزا کا نظام ناقص ہے: چالاک مجرم قانون سے بچ نکلتا ہے، بااثر ظالم سزا سے محفوظ رہتا ہے اور ایمان دار انسان بسا اوقات اپنی ایمان داری کی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ جب لوگ یہ منظر بار بار دیکھتے ہیں تو ان کا اخلاق پر اعتماد کمزور پڑ جاتا ہے اور "سب چلتا ہے" کی سوچ پروان چڑھتی ہے۔ ثالثاً، دنیاوی کامیابی کو ہی عمل کا معیار سمجھ لینے سے ظالم کی خوشحالی اچھائی کی دلیل اور مظلوم کی تنگی برائی کا ثبوت بن جاتی ہے، جو عقل و انصاف دونوں کے خلاف ہے۔ یہی وہ ذہنی فضا ہے جس کی اصلاح کے لیے جزا و سزا کا مکمل اسلامی تصور پیش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

جزاوسزا کے اسباب

شریعت کی رو سے جزاوسزا کے پیچھے کئی بنیادی اسباب کار فرما ہیں۔ پہلا سبب انسانی اختیار اور ذمہ داری ہے: انسان کو عقل، ارادہ اور خیر و شر کی تمیز دی گئی ہے، اسی لیے وہ مکلف ہے اور اسی بنیاد پر اس کے عمل کا بدلہ عدل کے تقاضے کے مطابق ہے۔ دوسرا سبب عدلِ الٰہی ہے: اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے اور اس کے ہاں ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ضائع نہیں ہوتی؛ جس حساب سے دنیا میں رہ جانے والی کمی آخرت کے مکمل عدل سے پوری ہو گی۔ تیسرا سبب اعمال کا فطری نتیجہ ہے: جس طرح آگ جلاتی ہے اور زہر نقصان دیتا ہے، اسی طرح ہر عمل اپنی نوعیت کے مطابق انسان کی شخصیت اور معاشرے پر اثر ڈالتا ہے؛ چوری، جھوٹ اور ظلم معاشرے میں بے اعتمادی اور انتشار پیدا کرتے ہیں جبکہ سچائی، امانت اور احسان اعتماد اور سکون پیدا کرتے ہیں۔ چوتھا سبب تربیت اور تنبیہ ہے: دنیاوی نتائج انسان کو متنبہ کرنے کے لیے بھی ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لے، اس لیے بسا اوقات مشکل اور آزمائش سزا نہیں بلکہ جھنجھوڑنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ پانچواں سبب ابتلا و امتحان ہے: دنیا دارالامتحان ہے، یہاں کی ہر خوشحالی جزا اور ہر تنگی سزا نہیں ہوتی، اصل جزاوسزا کا میدان آخرت ہے۔

جزاوسزا کی مختلف صورتیں

جزاوسزا کو صرف جنت و جہنم یا صرف عدالت کی سزا سمجھنا اس کی وسعت کو کم کر دیتا ہے۔ اسلامی تصور میں اس کی کئی صورتیں ہیں جو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور دنیاوی زندگی سے شروع ہو کر آخرت تک جاتی ہیں۔ ان صورتوں کو درج ذیل جدول میں خلاصہ طور پر دکھایا جا سکتا ہے۔

جدول: جزاوسزا کی مختلف صورتیں

مثالیں و آثار	میدان	صورت
نیکی پر قلبی اطمینان و سکون؛ برائی پر بے چینی، ضمیر کی ملامت اور ذہنی اضطراب	دنیا—فرد کی ذات	فطری و نفسیاتی نتائج

امانت دار کی عزت واعتماد؛ بد دیانت کا معاشرتی بائیکاٹ اور ساکھ کی تباہی	دنیا—معاشرہ	معاشرتی نتائج
حدود و تعزیرات اور دیوانی جرمانے، جو جرم کی روک تھام کے لیے ہیں	دنیا—ریاست وعدالت	قانونی سزائیں
مصیبت پر صبر کرنے والوں کے درجات کی بلندی؛ غافل کے لیے بیداری کا پیغام	دنیا—آزمائش	ابتلا و تنبیہ
قبر میں نیک کے لیے راحت اور بد عمل کے لیے تنگی	موت کے بعد—عالمِ برزخ	برزخی جزا و سزا
اعمال کا مکمل حساب، جنت کی نعمتیں یا جہنم کا عذاب؛ دائمی انجام	آخرت—حشر و حساب	اخروی جزا و سزا

اس جدول سے واضح ہوتا ہے کہ جزا و سزا ایک کثیر الجہت نظام ہے۔ دنیا میں اس کی صورتیں جزوی، عارضی اور اصلاحی نوعیت رکھتی ہیں، جبکہ آخرت کی صورت مکمل، حتمی اور ابدی ہے۔ یہی ترتیب انسان کو سمجھاتی ہے کہ دنیاوی نتیجہ عمل کی آخری قیمت نہیں ہے؛ اگر کسی نیک کو دنیا میں ظاہری نقصان ہوا تو وہ ضائع نہیں گیا، اور اگر کسی بد عمل کو دنیا میں ظاہری فائدہ ملا تو وہ بچ نہیں گیا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں اعمال کے دنیوی اور اخروی اثرات پر مفصل گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اعمال خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، ان کے نتائج نظامِ کائنات میں محفوظ رہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید نے بار بار یاد دلایا ہے کہ اللہ کے ہاں ہر عمل کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا (مفہوم، حوالہ: سورۃ آلِ عمران، آیت 25)۔

اخلاقی رویے کی اصلاح: عملی طریقہ کار

اب اصل سوال یہ ہے کہ اس تصور کو استعمال کرتے ہوئے کسی ایسے معاشرے کے اخلاقی رویے کی اصلاح کیسے کی جائے جہاں لوگ نتائج کو دنیا تک محدود سمجھتے ہوں۔ اس کے لیے چند مربوط اقدامات ضروری ہیں۔ پہلا قدم عقیدے کی تصحیح ہے: تعلیم، دروس اور ابلاغ کے ذریعے لوگوں کو یہ سمجھایا جائے کہ زندگی اس دنیا تک محدود نہیں، موت کے بعد برزخ اور پھر آخرت کا حساب یقینی ہے، اور کوئی عمل چھوٹا ہو یا بڑا، محفوظ رہتا ہے۔ جب یہ یقین دل میں بیٹھ جائے تو انسان کی نگرانی کا مرکز باہر کے قانون سے منتقل ہو کر اپنے ضمیر اور اللہ کی نگاہ پر آ جاتا ہے، جو اخلاق کی سب سے مضبوط بنیاد ہے۔ دوسرا قدم جزا و سزا کی دنیاوی صورتوں کو نمایاں کرنا ہے: لوگوں کو مطالعے اور مشاہدے سے دکھایا جائے کہ سچائی اور امانت کس طرح اعتماد اور رزق میں برکت لاتی ہے اور بد دیانتی کس طرح آخر ذلت اور نقصان کا باعث بنتی ہے۔ یہ مشاہداتی تربیت عقیدے کو تجربے سے جوڑ دیتی ہے۔

تیسرا قدم قانونی و ادارہ جاتی اصلاح ہے: معاشرے میں ایسا عادلانہ نظام ہو جہاں جرم کی سزا یقینی اور نیکی کی قدر دانی موجود ہو، کیونکہ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ قانون طاقت ور کو بھی پکڑتا ہے تو ان کا اخلاقی اعتماد بحال ہوتا ہے۔ چوتھا قدم تربیت و ماحول ہے: گھر، تعلیمی ادارے اور میڈیا اخلاقی نمونے پیش کریں، نیک افراد کو سراہا جائے اور بچوں کو ابتدا سے عمل و نتیجے کے تعلق کی سمجھ دی جائے۔ پانچواں قدم توبہ اور اصلاحِ نفس کا دروازہ کھلا رکھنا ہے: جزا و سزا کے تصور کو خوف کے ساتھ امید سے جوڑا جائے، یعنی بتایا جائے کہ اللہ کی رحمت وسیع ہے اور سچی توبہ گزشتہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے، تاکہ لوگ مایوسی کے بجائے اصلاح کی طرف آئیں۔ چھٹا قدم اجتماعی احتساب ہے: معاشرہ نرمی اور حکمت کے ساتھ نیکی کی ترغیب اور برائی سے روک کا فریضہ نبھائے۔ ان تمام اقدامات کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ جب انسان کا یقین اس بات پر پختہ ہو جائے کہ اس کا رب اسے دیکھ رہا ہے، اس کا کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا اور اسے اس کا پورا بدلہ ملے گا، تو اس کا اخلاق حالات کے تابع نہیں رہتا بلکہ اس کے ایمان کا ثمر بن جاتا ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اعمال کے نتائج کو صرف دنیاوی زندگی تک محدود سمجھنا اخلاق کو مشروط، عارضی اور کمزور بنا دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی تصورِ جزا و سزا — جس کے اسباب میں انسانی اختیار، عدلِ الٰہی، اعمال کے فطری نتائج، تربیت و تنبیہ اور ابتلا شامل ہیں، اور جس کی صورتیں نفسیاتی و معاشرتی نتائج سے لے کر قانونی سزاؤں، برزخی زندگی اور اخروی حساب تک پھیلی ہوئی ہیں — اخلاقی اصلاح کی مکمل بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس تصور کو عقیدے کی تصحیح، مشاہداتی تربیت، عادلانہ قانون، ساز گار ماحول اور توبہ کی امید کے ساتھ معاشرے میں زندہ کیا جائے تو لوگوں کا اخلاقی رویہ محض خوف یا لالچ کا نہیں بلکہ شعوری ایمان کا نتیجہ بن جاتا ہے، اور یہی شریعت کے فلسفے کی اصل روح ہے۔

سوال نمبر 3: محدود عقل اور انسانی ذمہ داری — شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں

سوال نمبر 3۔ ایک شخص کا یہ خیال ہے کہ چونکہ انسان کی عقل محدود ہے، اس لیے وہ اپنے اعمال کا مکمل ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کی تعلیمات کی روشنی میں اس موقف کا جائزہ لیں۔ (20)

تعارف

انسانی ذمہ داری کا سوال اخلاقیات اور شریعت دونوں کی بنیاد ہے۔ اگر انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں تو نہ حکم و ممانعت کا کوئی معنی رہتا ہے، نہ ثواب و عتاب کا اور نہ دنیا کے قوانین و سزاؤں کا۔ زیرِ بحث موقف یہ ہے کہ چونکہ انسانی عقل محدود ہے، وہ ہر بات کو پوری طرح نہیں جان سکتی اور بسا اوقات غلطی بھی کرتی ہے، اس لیے انسان کو اپنے اعمال کا مکمل ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ اعتراض بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے اور جدید دور میں مختلف صورتوں میں دہرایا بھی جاتا ہے۔ اس جواب میں پہلے اعتراض کی اصل شکل واضح کی جائے گی، پھر شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں انسان، عقل، اختیار اور تکلیف کے باہمی تعلق کو بیان کیا جائے گا، اور آخر میں تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے دکھایا جائے گا کہ عقل کے محدود ہونے سے ذمہ داری ختم نہیں ہوتی، البتہ اس کی نوعیت اور درجہ ضرور متعین ہو جاتا ہے۔

اعتراض کی وضاحت اور اس کی کمزوری کی جڑ

اعتراض کا خلاصہ یہ ہے: ذمہ داری کے لیے کامل علم و قدرت شرط ہے؛ انسان کا علم ناقص اور قدرت محدود ہے؛ لہٰذا اس کی ذمہ داری بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس استدلال میں جہاں ایک سچائی ہے وہیں ایک مغالطہ بھی پوشیدہ ہے۔ سچائی یہ ہے کہ انسانی عقل واقعی محدود ہے: وہ غیب کو نہیں جانتی، مستقبل کی مکمل پیش گوئی نہیں کر سکتی اور بسا اوقات قریبی امور میں بھی خطا کر جاتی ہے۔ قرآن مجید نے خود انسان کی علمی حیثیت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے (حوالہ: سورۃ الاسراء، آیت 85)۔ مگر مغالطہ یہ ہے کہ ذمہ داری کے لیے کامل علم شرط نہیں، بلکہ عمل کے لیے کافی علم و قدرت شرط ہے۔ دنیا کا کوئی نظام اس اصول کے بغیر نہیں چلتا: طالب علم اسی نصاب کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اسے پڑھایا گیا ہو، ملازم اسی کام کا جو اس کے سپرد کیا گیا ہو، اور ڈرائیور سڑک پر اسی احتیاط کا پابند ہوتا ہے جو اس کی بس میں ہو۔ اگر کامل علم شرط قرار دیا جائے تو نہ دنیا کی کوئی عدالت کسی مجرم کو سزا دے سکے، نہ والدین بچے کی تربیت کر سکیں اور نہ استاد شاگرد سے سوال کر سکے۔ اس لیے اصل سوال یہ نہیں کہ عقل محدود ہے یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ شریعت نے انسان پر ذمہ داری کس پیمانے سے ڈالی ہے۔

شاہ ولی اللہ کی تعلیمات: انسان، عقل اور اختیار

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں انسان کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اسے جسم اور روح کا مرکب قرار دیا ہے اور اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرنے والی چیز عقل، ارادہ اور اختیار بتائی ہے۔ فرشتے اطاعت ہی کے لیے پیدا کیے گئے، حیوانات اپنی جبلت کے تابع ہیں، مگر انسان کو یہ امتیاز دیا گیا کہ وہ سوچ کر فیصلہ کرتا ہے اور دو راستوں میں سے ایک کو اپنے ارادے سے منتخب کرتا ہے۔ یہی اختیار اس کی ذمہ داری کی بنیاد ہے۔ ولی اللہ کے نزدیک انسانی عقل کا ایک فطری دائرہ ہے جس میں وہ خیر و شر کی بنیادی باتیں خود بھی پہچان سکتی ہے؛ مثلاً سچ بولنا اچھا ہے، ظلم برا ہے، والدین کی خدمت نیکی ہے اور کمزور پر زیادتی قبیح ہے — یہ وہ حقائق ہیں جنھیں مختلف اقوام و اذہان نے مشترک طور پر تسلیم کیا ہے۔ تاہم عقل اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھی اس بات کی محتاج ہے کہ اسے تفصیلات اور انجام کی خبر دی جائے، اور اسی ضرورت کو وحی پوری کرتی ہے۔ یوں شاہ ولی اللہ کے نظام میں عقل اور وحی ایک دوسرے کے مقابل نہیں بلکہ معاون ہیں: عقل راستہ دیکھنے والی آنکھ ہے اور وحی اس راستے کی روشنی۔

شاہ ولی اللہ کی ایک اہم تعلیم یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر تکلیف اس کی وسعت اور استطاعت کے مطابق رکھی ہے۔ قرآن مجید کی اس صریح ہدایت کہ اللہ کسی جان پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا (حوالہ: سورۃ البقرۃ، آیت 286)، ولی اللہ کے فلسفۂ شریعت کی بنیادی شق ہے۔ اس اصول کی رو سے ذمہ داری 'مکمل' اس معنی میں نہیں کہ انسان سے لامحدود علم و قدرت کا مطالبہ ہو، بلکہ اس معنی میں ہے کہ جو کچھ اس کے بس میں تھا اور اسے معلوم تھا یا معلوم کرنا اس کے لیے ممکن تھا، اس کی جواب دہی اسی سے ہو گی۔ بھول، چُوک، حقیقی جہالت اور ناقابلِ تحمل مجبوری کو شریعت نے ذمہ داری سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ میں عاقل، بالغ اور مختار ہونا تکلیف کی شرائط میں شامل ہے؛ بچہ، مجنون اور مجبورِ محض مکلف نہیں۔ یہ استثنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ شریعت ذمہ داری کو عقل کی استطاعت سے جوڑتی ہے، اس کے محدود ہونے کو نظر انداز نہیں کرتی۔

کسب و اختیار: اعمال انسان کے اپنے کیے ہوئے ہیں

شاہ ولی اللہ کی تعلیمات میں ایک اور نکتہ 'کسب' کا ہے، یعنی اعمال کی نسبت انسان کی طرف درست طریقے سے کرنا۔ انسان اپنے عمل کو خالق کی طرح از خود پیدا نہیں کرتا، مگر وہ اسے اپنے ارادے اور ترجیح سے اختیار ضرور کرتا ہے، اور اسی اختیار و ترجیح کی بنیاد پر عمل اس کا 'کسب' کہلاتا ہے اور اسی پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔ اس کی سادہ مثال یوں سمجھی جا سکتی ہے کہ آگ جلاتے وقت جلنے کی طاقت اللہ کی پیدا کردہ ہے، مگر آگ میں ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ انسان کا اپنا ہوتا ہے؛ لہٰذا نقصان کی وجہ سزا میں انسان کو ہی ملتی ہے۔ اسی طرح جھوٹ بولنے میں زبان اور آواز کی قوت خدا کی عطا ہے، مگر جھوٹ کا انتخاب بندے کی ذمہ داری ہے۔ یہ تصور اعتراض کی وہ جڑ کاٹ دیتا ہے جو انسان کو اپنے عمل میں بالکل بے بس سمجھتی ہے۔ حقیقت درمیان میں ہے: نہ انسان ہر بات کا مکمل عالم ہے، نہ ہر بات سے بالکل بے خبر و بے اختیار؛ وہ ایک محدود دائرے میں مختار اور اسی دائرے میں جواب دہ ہے۔

تنقیدی جائزہ اور نتیجہ

اب اعتراض کا جائزہ لیا جائے تو تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اعتراض کا نصف حصہ درست ہے: انسانی عقل محدود ہے اور شریعت نے اس حد کو تسلیم کر کے تکلیف کو وسعت سے جوڑا ہے، بھول چوک اور جہلِ معذور کو سزا سے خارج کیا ہے، اور عقل کی رہنمائی کے لیے وحی کا انتظام کیا ہے۔ دوسری یہ کہ اعتراض کا نتیجہ غلط ہے: محدود عقل سے مکمل عدمِ ذمہ داری لازم نہیں آتی، کیونکہ ذمہ داری علم و قدرت کے اسی دائرے کے مطابق ہوتی ہے جو انسان کے پاس موجود ہے۔ انسان راستہ منتخب کرنے، کوشش کرنے اور جان بوجھ کر برائی اختیار کرنے کی حد تک یقیناً ذمہ دار ہے۔ تیسری یہ کہ اگر یہ وصف تسلیم کر لیا جائے تو اخلاق، قانون، تعلیم و تربیت اور معاشرتی احتساب — سب بے بنیاد ہو جائیں گے؛ کیونکہ سزا و جزا، انعام و تنبیہ کی ساری مشق اسی مفروضے پر کھڑی ہے کہ انسان اپنے کیے کا جواب دہ ہے۔ خود اعتراض کرنے والا شخص بھی عملی زندگی میں اپنے ساتھ کیے گئے ظلم پر مجرم کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے، جو ثابت کرتا ہے کہ یہ موقف نظری مغالطہ ہے، عملی عقیدہ نہیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں عقل کا محدود ہونا ذمہ داری کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کی شرائط متعین کرتا ہے۔ انسان جسم و روح کا مرکب، صاحبِ عقل اور صاحبِ اختیار مخلوق ہے؛ اس پر تکلیف اس کی وسعت کے مطابق ہے؛ عقل کی کمی وحی کی رہنمائی سے پوری کی گئی ہے؛ اور اس کے اعمال اس کا کسب ہیں جن پر وہ اپنے دائرۂ علم و قدرت کے اندر مکمل جواب دہ ہے۔ اس متوازن تصور سے نہ انسان کو خدا بنا کر ناممکن مطالبات کا بوجھ ڈالا گیا ہے اور نہ اسے جانور یا مشین بنا کر ذمہ داری سے آزاد کیا گیا ہے؛ یہی توازن فلسفۂ شریعت کی خوبصورتی اور اس موقف کا مکمل جواب ہے۔

سوال نمبر 4: جزا و سزا، موت، برزخ اور حشر — انسانی اعمال کا مسلسل تعلق

سوال نمبر 4۔ دنیا میں جزا و سزا، موت، عالمِ برزخ اور احوالِ حشر کے مباحث کو باہم مربوط کرتے ہوئے واضح کریں کہ انسانی اعمال کے اثرات دنیا اور آخرت کے تصور میں کس طرح ایک مسلسل تعلق پیدا کرتے ہیں؟ (20)

تعارف

اسلامی تصورِ حیات کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کے بجائے ایک مسلسل سفر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس سفر کے مراحل — دنیا، موت، برزخ، حشر اور آخرت — ایک دوسرے سے کٹے ہوئے نہیں، بلکہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں، اور اس زنجیر کو جوڑنے والی چیز انسانی اعمال ہیں۔ انسان جو کچھ اس دنیا میں بوتا ہے، اس کی فصل موت کے بعد بھی اگتی ہے، برزخ میں بھی اس کے اثرات سامنے آتے ہیں اور حشر میں مکمل پھل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس جواب میں ان مباحث کو الگ الگ مختصر بیان کرنے کے بجائے انھیں باہم مربوط کر کے دکھایا جائے گا کہ کس طرح انسانی اعمال کے اثرات دنیا سے آخرت تک ایک مسلسل تعلق قائم رکھتے ہیں، اور یہ تسلسل انسان کی اخلاقی زندگی اور فلسفۂ شریعت دونوں میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔

پہلی کڑی: دنیا میں جزا و سزا

اس سلسلے کا آغاز دنیا سے ہوتا ہے۔ شریعت کی رو سے اعمال کے کچھ نتائج اسی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں نفسیاتی نتائج سب سے پہلے ہیں: نیکی قلب کو سکون اور شرحِ صدر عطا کرتی ہے جبکہ گناہ، خواہ چھپ کر کیا گیا ہو، دل میں تنگی، بے چینی اور ضمیر کی گربت پیدا کرتا ہے۔ بعض گناہوں کے معاشرتی نتائج بھی دنیا میں نظر آتے ہیں: جھوٹ بولنے والے پر اعتماد ختم ہو جاتا ہے، خیانت کرنے والا اپنی ساکھ کھو دیتا ہے اور ظلم بالآخر ظالم کے اپنے گھر اور نظام کو بھی برباد کرتا ہے۔ اس کے ساتھ قانونی سزائیں بھی اسی دنیاوی نظام کا حصہ ہیں جن کا مقصد جرم کی روک تھام اور معاشرتی نظم کی حفاظت ہے۔ تاہم یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ دنیا کی جزا و سزا جزوی اور نامکمل ہے: یہاں ہر نیکی کا پورا صلہ نہیں ملتا اور نہ ہر برائی کی پوری سزا؛ بعض اوقات نیک آزمائش میں اور بد نعمتوں میں ہوتا ہے، کیونکہ دنیا اصل میں جزا کا گھر نہیں، امتحان کا گھر ہے۔ یہی نامکملیت اگلی کڑیوں کی ضرورت پیدا کرتی ہے: اگر سلسلہ یہیں ختم ہو جائے تو عدل ادھورا رہ جائے گا۔

دوسری کڑی: موت — اختتام نہیں، منتقلی

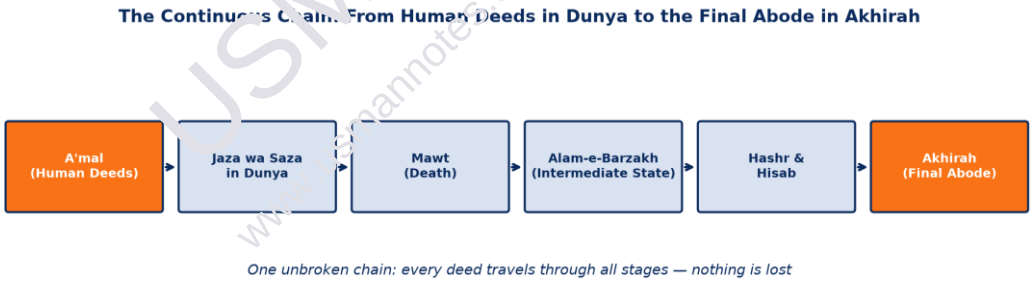
عام تصور میں موت زندگی کا خاتمہ سمجھی جاتی ہے، مگر اسلامی تعلیمات میں موت ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقلی کا نام ہے۔ جسم مٹی میں مل جاتا ہے مگر روح باقی رہتی ہے، اور سب سے اہم بات یہ کہ موت کے ساتھ اعمال کا باب بند ہو جاتا ہے مگر اعمال کے اثرات کا باب بند نہیں ہوتا۔ ایک حدیثِ مبارکہ کے مفہوم کے مطابق انسان کے مرنے کے بعد اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزیں جاری رہتی ہیں: صدقۂ جاریہ، وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے (حوالہ: صحیح مسلم)۔ یہ اصول 'مسلسل تعلق' کی سب سے روشن مثال ہے: انسان خود دنیا سے رخصت ہو گیا مگر اس کے لگائے ہوئے درخت کا پھل، اس کی پھیلائی ہوئی علم کی روشنی اور اس کی تربیت کی ہوئی نسل کا عمل اس کے کھاتے میں شامل ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس برائی کے پھیلائے ہوئے ذرائع بھی اسی طرح چلتے رہتے ہیں۔ یوں موت اعمال کے اثرات کو ختم نہیں کرتی، صرف انسان کی 'مزید عمل کرنے کی مہلت' ختم کرتی ہے؛ اثرات کا حساب جاری رہتا ہے

تیسری کڑی: عالمِ برزخ

موت اور قیامت کے درمیانی زمانے کو عالمِ برزخ کہا جاتا ہے۔ اس مرحلے میں روح اپنے دنیاوی اعمال کے ابتدائی نتائج سے روشناس ہوتی ہے: نیک انسان کے لیے قبر میں کشادگی اور راحت کا ذکر احادیث میں آیا ہے، اور بد عمل کے لیے تنگی و عذاب کا۔ برزخ کا یہ مرحلہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اولاً یہ ثابت کرتا ہے کہ جزا و سزا محض جسمانی زندگی سے وابستہ نہیں، کیونکہ جسم بکھر چکا ہوتا ہے مگر روح اپنے اعمال کا سامنا کر رہی ہوتی ہے۔ ثانیاً یہ اعمال کے اثرات کا وہ درمیانی پل ہے جس سے آخرت کا تصور محض ایک دور دراز وعدہ نہیں رہتا بلکہ موت کے فوراً بعد شروع ہونے والی حقیقت بن جاتا ہے۔ ثالثاً برزخ میں اعمال خود ظاہر ہوتے ہیں: روایات کے مفہوم کے مطابق نماز، روزہ، زکاۃ اور صلہ رحمی جیسے اعمال انسان کے گرد اس کی حفاظت و انس کی صورت میں جمع ہوتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تصور میں اعمال مردہ تحریریں نہیں بلکہ انسان کی شخصیت کا حصہ بن کر اس کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔

چوتھی کڑی: احوالِ حشر اور مکمل حساب

اس زنجیر کی مکمل کڑی حشر ہے، جب اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے اپنے سامنے جمع کرے گا اور اعمال کا مکمل اور حتمی حساب ہو گا۔ قرآن مجید نے اس دن کو 'یومِ دین' یعنی جزا کا دن قرار دیا ہے اور بار بار واضح فرمایا ہے کہ ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی اعمال نامے میں موجود پائی جائے گی (مفہوم، حوالہ: سورۃ الزلزال، آیات 7-8)۔ حشر کے احوال میں اعمال نامے کا پیش ہونا، میزان میں اعمال کا تلنا، پلِ صراط سے گزرنا اور ہر انسان کا اپنے رب کے سامنے اپنے عمل کا جواب دینا شامل ہے۔ اس مرحلے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں جزا و سزا کامل ہو گی: نہ کسی کے ساتھ ظلم ہو گا، نہ کسی کا عمل ضائع جائے گا، نہ سفارش و سفارشِ باطل کام آئے گی۔ دنیا میں رہ جانے والی تمام کسریں یہاں پوری ہو جائے گی — مظلوم کو اس کا حق ملے گا اور ظالم اپنے ظلم کا پورا بوجھ اٹھائے گا، یہاں تک کہ جانوروں تک کے باہمی حقوق کا فیصلہ ہو گا، جیسا کہ احادیث کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے۔



شکل: اعمال سے آخرت تک — جزا و سزا کا مسلسل سلسلہ

مسلسل تعلق کی نوعیت: باہمی ربط کا تجزیہ

اب ان مباحث کو باہم مربوط کر کے دیکھیں تو اعمال اور ان کے اثرات کے درمیان تعلق کی کئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی جہت علیّت کی ہے: ہر مرحلہ پچھلے مرحلے کا نتیجہ ہے — دنیا کے اعمال برزخ کی حالت کا سبب ہیں اور برزخ حشر کی پیش بندی ہے۔ دوسری جہت انعکاس کی ہے: اخروی مراحل دنیاوی اعمال کی اصل شکل کو بے نقاب کرتے ہیں؛ دنیا میں عمل نظر آتا تھا، آخرت میں اس کی حقیقت نظر آئے گی کہ کون سا عمل خالص تھا اور کون سا ریاکاری۔ تیسری جہت تربیت کی ہے: یہ تسلسل انسان کو دنیا میں محتاط بناتا ہے کہ وہ لمحاتی لذت کو ابدی انجام پر قربان نہ کرے۔ چوتھی جہت عدل کی ہے: اس کائناتی نظام میں کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا، اس لیے زندگی 'اتفاق' نہیں بلکہ ایک

بامقصد اور باقاعدہ نظام بن جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اعمال کے نظام کو اسی طرح باہم مربوط بیان کیا ہے کہ انسان کا ہر عمل اس کی روح پر نقش چھوڑ تا ہے، اور یہی نقش بڑھتا اور پک پک کر آخرت میں اس کی صورت و انجام کی بنیاد بنتا ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں جزا و سزا، موت، عالمِ برزخ اور احوالِ حشر الگ الگ موضوعات نہیں بلکہ ایک مسلسل نظام کے مرحلے ہیں، اور انسانی اعمال ان مراحل کو آپس میں جوڑنے والی کڑی ہیں۔ دنیا میں اعمال کیے جاتے ہیں اور ان کے جزوی اثرات ظاہر ہوتے ہیں؛ موت عمل کی مہلت ختم کرتی ہے مگر اثرات جاری رکھتی ہے؛ برزخ میں روح ان اثرات کا پہلا سامنا کرتی ہے؛ اور حشر میں وہی اعمال مکمل حساب اور حتمی انجام کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ اس تسلسل کو سمجھ لینے سے زندگی ایک بامقصد سفر بن جاتی ہے جس میں کوئی نیکی حقیر اور کوئی بدی بے اثر نہیں، اور یہی احساس فلسفۂ شریعت میں انسانی رویے کی اصلاح کی مضبوط ترین بنیاد ہے۔

سوال نمبر 5: معاشرتی تعلقات میں قانون اور اخلاقی ذمہ داری — ایک تنقیدی جائزہ

سوال نمبر 5۔ آدابِ معاشرت، والدین کی اطاعت، اولاد کی تربیت، خادم و مخدوم کے حقوق اور محتاجوں کی مدد کے مباحث کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیں کہ معاشرتی تعلقات میں صرف قانونی پابندیاں کافی ہیں یا اخلاقی ذمہ داری بھی ضروری ہے۔ (20)

تعارف

ہر معاشرہ دو طرح کی رسیوں سے بندھا ہوتا ہے: ایک قانون کی ظاہری رسی، جو ڈر اور سزا سے نظم قائم کرتی ہے، اور دوسری اخلاق کی باطنی رسی، جو ضمیر اور اقدار سے رشتوں کو زندگی دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا معاشرتی تعلقات کو قائم رکھنے کے لیے صرف قانونی پابندیاں کافی ہیں یا اخلاقی ذمہ داری بھی اسی قدر ضروری ہے؟ اسلامی تعلیمات میں معاشرت کے بنیادی دائرے — عام آدابِ معاشرت، والدین کی اطاعت، اولاد کی تربیت، خادم و مخدوم کے حقوق اور محتاجوں کی مدد — اس سوال کو جانچنے کے

بہترین میدان ہیں، کیونکہ یہی وہ تعلقات ہیں جہاں قانون کی دسترس محدود اور اخلاق کا کردار فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اس جواب میں پہلے ان مباحث کا جائزہ لیا جائے گا، پھر قانون کی حدود اور اخلاق کی ضرورت کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

آدابِ معاشرت اور والدین کی اطاعت

آدابِ معاشرت کا تعلق روزمرہ کے برتاؤ سے ہے: سلام میں پہل، نرم گفتگو، دوسروں کی عزت، وعدے کی پابندی، ہمسائے کے حقوق اور مجلس کے آداب۔ ان امور کا بڑا حصہ کسی قانون کے تحت قابلِ سزا نہیں ہوتا؛ کوئی عدالت کسی شخص کو محض بدتمیزی یا روکھے پن پر سزا نہیں دے سکتی، مگر یہی چیزیں معاشرے کا اصل مزاج بناتی ہیں۔ جس معاشرے میں قانونی نظم مضبوط مگر آدابِ معاشرت مردہ ہو، وہاں زندگی بے رونق اور بے اعتماد ہو جاتی ہے۔ والدین کی اطاعت اس بحث کی روشن ترین مثال ہے۔ قانون زیادہ سے زیادہ اولاد پر والدین کی کفالت کی ایک حد مقرر کر سکتا ہے، مگر والدین کے سامنے اُف تک نہ کرنا، نرمی سے بولنا، ان کی خدمت کو سعادت سمجھنا اور ان کے لیے دعا کرنا — یہ وہ سطح ہے جسے کوئی قانون پیدا نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید نے والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے اور بڑھاپے میں ان کے ساتھ شفقت و عاجزی کا رویہ سکھایا ہے (مفہوم، حوالہ: سورۃ الاسراء، آیات 23-24)۔ یہ احسان خالص اخلاقی و روحانی ذمہ داری ہے؛ قانون کی زبان میں اسے لکھا ہی نہیں جا سکتا، مگر گھر کی اصل بہار اسی سے ہے۔

اولاد کی تربیت اور خادم و مخدوم کے حقوق

اولاد کی تربیت کے باب میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ قانون والدین کو بچے کی خوراک، تعلیم اور حفاظت کا پابند کر سکتا ہے، مگر بچے کے دل میں ایمان، کردار، سچائی اور ہمدردی بسانا صرف اخلاقی و دینی تربیت سے ممکن ہے۔ تربیت کا اصل کام محبت، نمونے اور وقت دینے سے ہوتا ہے، اور یہ تینوں چیزیں کسی عدالت کے حکم سے حاصل نہیں ہوتیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن گھروں میں صرف 'قانونی' ذمہ داری پوری ہوئی مگر اخلاقی تربیت نہ ہوئی، وہاں اولاد جسمانی طور پر پلی مگر روحانی طور پر یتیم رہی۔ خادم و مخدوم یعنی ملازم اور مالک کے تعلق میں بھی دو پہلو ہیں: قانون اجرت، اوقاتِ کار اور ظالمانہ سلوک کی ممانعت جیسی کم از کم حدیں مقرر کرتا ہے، جو بلاشبہ ضروری ہیں۔ مگر مالک کا

ملازم کے ساتھ کھانے پینے میں شفقت، اس کی عزتِ نفس کا احترام، کام اس کی طاقت کے مطابق دینا اور اس کے حقوق میں پیش قدمی — یہ اخلاق کا دائرہ ہے۔ نبوی تعلیمات میں ماتحتوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کی اجرت وقت پر دینے کی جو تاکید ملی ہے، وہ اس تعلق کو استحصالی معاہدے سے نکال کر انسانی رشتہ بنا دیتی ہے۔

محتاجوں کی مدد: جہاں قانون بالکل خاموش ہے

محتاجوں کی مدد اس سوال کی سب سے واضح مثال ہے۔ زکاۃ کے سوا فقرا و مساکین پر خرچ کرنا قانوناً کسی پر لازم نہیں کیا جا سکتا؛ کوئی غریب کسی امیر کے خلاف اس بنیاد پر مقدمہ نہیں کر سکتا کہ اس نے اس کی مدد کیوں نہ کی۔ مگر اسلام نے اسے اخلاقی اور دینی فریضے کی حیثیت دے کر معاشرے کی بنیادی ضرورت بنا دیا ہے: بھوکے کو کھلانا، ضرورت مند کی حاجت پوری کرنا اور محتاج کا ہاتھ تھامنا ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس دائرے کو صرف قانون پر چھوڑ دیا جائے تو ہر وہ محتاج جو زکاۃ کے نصاب و نظام سے باہر ہو، بھوکا رہ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرے کی اصل فلاحی قوت سرکاری قانون نہیں بلکہ لاکھوں افراد کا وہ اخلاقی احساس ہے جو انھیں اپنی ضرورت سے زائد دوسروں پر خرچ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ صدقات، وقف اور خیراتی ادارے اسی اخلاقی ذمہ داری کی ادارہ جاتی صورتیں ہیں۔ اس کے برعکس جہاں یہ احساس مر جائے، وہاں قانون کی کثرت کے باوجود فقر و استحصال ختم نہیں ہوتا۔

تنقیدی جائزہ: قانون کی حدود اور اخلاق کی ناگزیر حیثیت

ان مباحث کی روشنی میں تنقیدی جائزہ یہ ہے کہ قانون اور اخلاق کو ایک دوسرے کا حریف سمجھنا غلطی ہے؛ دونوں کی حیثیت اور دائرہ الگ الگ ہے۔ قانون کی طاقت اس کی کم از کم حدود کی حفاظت میں ہے: یہ کمزور کو طاقت ور کے ظلم سے بچاتا ہے، معاہدوں کو نافذ کرتا ہے اور معاشرے میں ایک بنیادی نظم قائم رکھتا ہے۔ اس کے بغیر اخلاق کی اپیلیں بے اثر ہو جائیں گی، کیونکہ شریر عناصر کے لیے صرف وعظ کافی نہیں ہوتا۔ مگر قانون کی حدود بھی واضح ہیں: اولاً قانون صرف ظاہر کو پکڑ سکتا ہے، نیت اور رویے کو نہیں۔ ثانیاً قانون ہر رشتے کی گرمی اور نرمی پیدا نہیں کر سکتا؛ عدالت سے نکاح یا خدمت کا حکم مل سکتا ہے، محبت نہیں۔ ثالثاً قانون کی گرفت سے بچنے کے ہزار راستے نکل آتے ہیں، جبکہ ضمیر کی گرفت سے کوئی راستہ نہیں۔ رابعاً قانون کی کثرت خود ایک بوجھ بن جاتی ہے اور نگرانی کا نظام لامحدود خرچ مانگتا ہے۔ اس لیے پختہ نتیجہ یہ ہے کہ معاشرتی

تعلقات میں قانون بنیاد کی حفاظت کرتا ہے اور اخلاق اس عمارت کو قابلِ رہائش بناتا ہے؛ دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کا متبادل قرار دینا معاشرتی نظام کی خرابی کا سبب بنتا ہے۔

جدول: معاشرتی تعلقات میں قانون اور اخلاق کی تکمیلی حیثیت

اخلاق کا کردار	قانون کا کردار	پہلو
نیتیں، رویے اور دل کے جذبات	ظاہری اعمال اور قابلِ ثبوت حقوق	دائرہ
ضمیر کی آواز، ایمان اور معاشرتی قدریں	سزا کا خوف اور ادارہ جاتی نفاذ	طریقہ کار
احسان، شفقت، دعا اور خدمت کی سعادت	کفالت کی کم از کم حد لازم کرنا	مثال: والدین
نفلی صدقہ، فیاضی اور خود پیش قدمی	زکاۃ جیسے نظام کا نفاذ	مثال: محتاج
منظم تحفظ اور جبر کی قوت نہیں رکھتا	گرم جوشی اور محبت پیدا نہیں کر سکتا	کمزوری

اسلامی شریعت کی خوبصورتی یہی ہے کہ اس نے دونوں کو ایک نظام میں سمو دیا ہے۔ ایک طرف حدود و قوانین سے معاشرے کی کم از کم حفاظت یقینی بنائی ہے اور دوسری طرف قرآن و سنت نے تقویٰ، احسان اور مکارمِ اخلاق کی ایسی بلند سطح پیش کی ہے جس میں انسان قانون کی اطاعت سے آگے بڑھ کر اخلاقی ذمہ داری کو اپنی رضا و رغبت سے قبول کرتا ہے۔ اسی امتزاج کا نام دراصل 'فلسفۂ شریعت' کی معاشرتی حکمت ہے: قانون معاشرے کی بنیاد کھڑی کرتا ہے اور اخلاق اس میں زندگی بھر دیتا ہے۔ جو معاشرہ صرف قانون پر بھروسا کرے گا وہ ٹھنڈا، خشک اور مقدمہ باز ہو گا؛ جو صرف اخلاق پر بھروسا کرے گا وہ کمزوروں کے لیے غیر محفوظ ہو گا؛ اور جو دونوں کو ساتھ رکھے گا وہی متوازن اور مہذب معاشرہ کہلائے گا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ آدابِ معاشرت، والدین کی اطاعت، اولاد کی تربیت، خادم و مخدوم کے حقوق اور محتاجوں کی مدد جیسے مباحث واضح کرتے ہیں کہ معاشرتی تعلقات کا زیادہ حصہ قانون کی گرفت سے باہر اور اخلاق کی ذمہ داری کے اندر رہے۔ قانونی پابندیاں ضروری ہیں مگر کافی نہیں؛ ان کے ساتھ اخلاقی ذمہ داری — جو ایمان، ضمیر اور احسان سے پروان چڑھتی ہے — ناگزیر ہے۔ تنقیدی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ قانون معاشرے کی بنیاد کی حفاظت کرتا ہے اور اخلاق اسے انسانیت، گرم جوشی اور اعتماد عطا کرتا ہے؛ فلسفۂ شریعت دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے، اور اسی توازن میں صحت مند معاشرے کا راز پوشیدہ ہے۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com